طرف چل دی۔

شام کا دھندلکا باہر چھایا ہوا تھا۔ دن بھر کے سفر کی وجہ سے بچے تھک گئے تھے لہٰذا آرام سے اپنی نشستوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ اب کوپے میں قدرے سکون تھا۔

یوں تو بچے ایک بہت بڑی مصیبت ہیں لیکن سفر میں یہ مصیبت ایک آفت بن جاتی ہے جس کا مداوا کم از کم ایک ماں کے پاس تو نہیں ہوتا۔ سفر میں ان کی طبیعت کے ایسے ایسے جوہر کھلتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ گاڑی کے ڈبوں میں یہی ننھے ننھیاں دیوزادوں کا روپ دھار کر نتھنے پھیلائے "آدم بو! آدم بو!" کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی دیوزادوں سے مجھے پالا پڑا تھا اور میں آدم زاد شہزادی کی طرح انہیں دیکھ دیکھ کر کبھی ہنستی اور کبھی روتی تھی۔ اس بے بسی کے عالم میں بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہر ایک کی ٹھکائی کر دی۔ اس مار کٹائی اور چھینا جھپٹی میں ملتان کا سٹیشن آ گیا۔ شام رات سے گلے مل رہی تھی۔ باہر اندھیرا دبے پاؤں رینگ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر ایک نظر باہر دیکھا۔ ایسی کئی شامیں ہوسٹل میں چپکے چپکے آتی تھیں اور رات کی اندھیری کھڈ میں اتر جاتی تھیں۔ ایسے لمحوں میں ساری لڑکیاں اپنے دروازوں کے کھٹکے چڑھا کر اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتیں اور اپنی بھیگی ہوئی پلکوں کو پونچھے بغیر جالی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگتیں۔ ہر کمرے میں ساون رُت آ جاتی مگر جھڑی نہ لگتی۔

آج بھی کچھ ایسی ہی شام تھی مگر یہ ہوسٹل نہ تھا ملتان کا سٹیشن تھا۔ یہ میرا محبوب کمرہ نہ تھا۔ سبز رنگ کی گاڑی کا ایک ڈبہ تھا۔ یہاں میز کرسیوں پر میری کتابیں نہ پڑی تھیں بلکہ سیٹوں پر تین ظلمن منتھنے بچے پڑے تھے۔ وہاں سے یہاں تک کوئی لمبا فاصلہ نہ تھا پھر بھی کس قدر دُوری تھی۔ کتنا بعد، کتنی مسافت ــــ میں نے اکتا کر شیشہ چڑھا دیا اور کھڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

کسی نے شیشہ بجایا مگر میں نے توجہ نہ دی۔

"بھئی ذرا دروازہ کھولیے!" آواز گڑگڑائی۔

"کیا مصیبت ہے۔" میں نے ویسے ہی کہا۔ "یہ کوئی ریزرو ہے۔"

لیکن شاید اسے میری آواز سنائی نہ دی اور شیشے پر اسی طرح انگلی بجتی رہی۔ میں نے منہ پھیر کر قہر آلود نگاہوں سے ادھر دیکھا۔

ہائے وہ تو پولی تھی۔ میری پولی۔ سارے کالج کی پولی!

اس نے میری صورت دیکھتے ہی چیخ کر کہا:

"ارجمند ــــ"

دروازہ کھلا اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

بچے گردنیں اٹھا اٹھا کر حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ سامنے بیڑی پیتے ہوئے ایک پھل فروش نے ہمیں بغل گیر ہوتے دیکھ کر پیار بھری نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر جھک کر ٹٹخنہ کھجانے لگا۔

اپنا پرس سیٹ پر ڈالتے ہوئے پولی بچوں کی طرف اشارہ کر کے بولی:

"یہ سب تمہارے ہیں ارجی؟"

"ہاں ــــ" میں نے اعتراف کیا۔

"تو تم ان کی تربیت نفسیات کے اصولوں پر کر رہی ہو نا جیسے تم کہا کرتی تھیں۔"

اس نے پوچھا۔

"ہاں پولی۔" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"شادی سے پہلے تو بچوں کی تربیت کے مجھے تین نفسیاتی طریق یاد تھے۔ اب میرے تین بچے ہیں اور ایک بھی طریق یاد نہیں۔"

اس پر پولی ذرا سا مسکرائی اور بڑے تکلف سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"اور تمہارے بچے کہاں ہیں پولی؟" میں نے اپنی سیٹ جھاڑ کر پوچھا۔

"میرے بچے! ـــــ میری شادی نہیں ہوئی ارجی!" اس نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

"یعنی؟ ـــــ"

"آج تقریباً دس سال ہوئے ہیں اس بات کو ـــــ" پولی نے اتنا کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

وہ مجھے اب بھی کالج والی پولی نظر آ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ پہنے، کندھوں پر سفید شال ڈالے وہ بالکل چینی گڑیا معلوم ہو رہی تھی لیکن اس کے بال اب ویسے نہیں رہے تھے۔ وہ مکئی کے بھونٹوں کی طرح دھونسے جا چکے تھے اور اس کی جلد میں وہ نمایاں دل کشی نہیں تھی پر اس کی معصومیت میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"پولی شادی کر لو!" میں نے جانے کیا سوچ کر کہا۔

"کیوں ارجی! یہ ذمہ داریاں بہت بھائیں تمہیں ـــ؟" اس نے تکیے پر سر رکھ کر پوچھا۔

"میں لیٹ جاؤں ارجی؟"

"ضرور ضرور۔ مجھے تعجب ہے پولی! تم نے شادی کیوں نہ کی؟" میں نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"تم حسین تھیں۔ سمجھدار تھیں۔ گھریلو کاموں میں طاق تھیں ـــ اور ـــ"

"پھر بھی میری شادی نہ ہو سکی۔"

"کیوں ـــ؟"

"میں جو کچھ چاہتی تھی وہ مجھے ملا نہیں۔"

"تم کیا چاہتی تھیں؟"

"خلوص ـــ مگر شاید مجھے کچھ اور کہنا چاہیے۔ بہرحال میرے واقعات سن لو۔"

"خدا جانے آج تمہیں دیکھ کر دل میں کچھ سوا درد ہوتا ہے۔"

"ارجی! شاید تمہیں یاد ہوگا۔ کالج کی آخری ٹرم میں وہ دبلا پتلا لڑکا ارجن ـــ وہی ناجس کی آنکھ میں نقص تھا ـــ اچھا تھا بیچارہ۔"

"وہی ناجو ذرا اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔ سُرجیت کا بھائی؟ کھلاڑی تھا شاید۔"

"ہاں ہاں۔ وہی تو میری محبت کا دم بھرنے لگا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی بات پسند نہ تھی ـــ اور وہ آرچر۔ وہ لمبا چوڑا جوان، وہ بھی مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔"

پولی اپنی انگلی کے ایک چھلّے کے ساتھ کھیلنے لگی جس میں چھوٹے چھوٹے یاقوت ریزے جڑے تھے۔

"ارجی! تمہیں کلثوم یاد ہے؟ وہی جس کی آنکھیں بہت پیاری تھیں۔"

"کون سی کلثوم؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو فرسٹ ایئر میں آئی تھی۔ جسے سب میرا دم چھلا کہا کرتی تھیں ـــ وہی کلثوم جس نے پہلے ہی روز تمہارے کمرے میں بیٹھ کر پیارے پیارے گیت گائے تھے۔"

"ارے ہاں وہی کلثوم ناجس کے بال اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔"

"بالکل۔ اس کا چچازاد بھائی دیکھا تھا تم نے؟ مقصود!"

"ہوں۔ ارے ہاں۔ ایمان سے بڑا اسمارٹ لڑکا تھا۔ وہی ناجو گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا اور کلثوم کے پیچھے دیوانہ تھا۔ ہر ہفتے اسے ملنے بھی آیا کرتا تھا۔"

"ہاں وہی مقصود! جانتی ہو ارجی! وہ کلثوم کو چھوڑ کر میرے پیچھے دیوانہ ہوگیا ـــ اور اس نے اپنی دیوانگی کا ثبوت بھی دے دیا۔"

میں پولی کے قریب کھسک آئی۔

"کلثوم کی سالگرہ پر میں پہلے پہل اس سے ملی تھی۔ وہ باغیچہ میں کلثوم سے ملنے کیلیے

خدا جانے کب سے بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہم لوگوں میں اس طرح گھری ہوئی تھی کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی — لیکن ایک موقع ایسا بھی آیا کہ وہ کمرے سے کھسک گئی اور وہ جب دس پندرہ منٹ برابر غائب رہی تو مجھے اسے ڈھونڈنے باغ کی طرف بھی جانا پڑا۔ وہ بنچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھی مقصود کے ساتھ باتیں کر رہی تھی لیکن میری آمد پر اسے اپنی خفت مٹانے کے لیے مقصود سے میرا تعارف کرانا ہی پڑا اور ارچی! — مقصود اس بچے کی طرح مجھے گھورتا رہا جس نے گرمیوں میں پہلی بار آئس کریم دیکھی ہو — میں گھبرا گئی — اس کے بعد جب کبھی وہ کلثوم سے ملنے آتا، کلثوم مجھے اپنے ساتھ زبردستی گھسیٹ کر کسی نہ کسی بہانے لے جاتی اور مجھے اس سے ملنا ہی پڑتا — لیکن ارچی! بقول ہم لڑکیوں کے چونکہ میں نے اسے کوئی لفٹ نہ دی اس لیے وہ مجھے HIGH BROW پکارنے لگا۔"

پولی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

"مقصود بیک وقت ایک شاعر اور زمانہ پرست انسان تھا۔ وہ کھلکھلا کر قہقہہ بھی لگا سکتا تھا اور نمناک آنکھوں سے دوسرے کا درد بھی بٹا سکتا تھا۔ وہ ادیب بھی تھا اور سیاسیات کا طالب علم بھی۔ رفتہ رفتہ میں جان گئی کہ مجھے چاہنے کے باوجود وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ شدت سے چاہ بھی سکتا تھا اور عمل کی راہ میں بیگانہ بھی رہتا تھا — ارچی! — وہ عجیب لڑکا تھا لیکن کس قدر دلفریب، کیسا بھولا بھالا اور کیسا چالاک۔"

پولی ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ بیتے دنوں کی طرف لوٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن میں نے اسے جھنجھوڑا اور کہا:

"اب یہ راز کھول دو۔ یہ تجسس تو مجھے مار ڈالے گا پولی!"

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو گالیاں آپ ہی چھلک گئیں۔ آنسوؤں کے باوجود ان میں عجیب بے رونقی تھی۔ وہ سپنوں کی طرح نہ تو سنولائی ہوئی تھی اور نہ ہی راکھ کی طرح

بجھی بجھی۔ پھر بھی میں نے دیکھا ان میں وہ بات نہ رہی تھی جو کالج میں ہوا کرتی تھی۔ اس نے بڑے تھکے ماندے سے انداز میں کہا:

"بی۔ اے کرنے کے بعد میں نے بی ٹی کی اور پھر سرگودھا سیکنڈ مسٹرس ہو کر چلی گئی۔ تقریباً سال بھر، نہیں، ڈیڑھ سال وہاں کام کیا۔ پھر میری تبدیلی گورداسپور ہو گئی — تم نے گورداسپور دیکھا ہے! چھوٹا سا شہر، بڑا سا قصبہ۔ گرمیوں میں وہاں بڑے دھڑتے سے بارشیں ہوا کرتیں۔ دھرم سالہ جاتی ہوئی ہوائیں وہاں ضرور پھوٹ پڑتیں۔ بڑے آم جامن ہوتے تھے وہاں —"

ایک ایسے ہی دن جب موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ میں اور باقی استانیاں بیٹھی آم کھا رہی تھیں کہ مائی میرے پاس ایک چٹ لے کر آئی، لکھا تھا:

"کہاں کھو گئیں تم۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے۔ ابھی آ کر ملو۔ . . . ."

اور میں یہ پرزہ اپنی ہمجولیوں سے چھپاتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ مقصود بھیگے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ستون کا سہارا لیے یوں کھڑا تھا جیسے ڈیڈی کی بھولی بسری چھڑی کمرے کے کونے میں لگی رہتی ہے۔ اس کی عینک کے دھندلے شیشوں کے پیچھے سے دو دھبے نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ اس کی آنکھیں تھیں۔

"ہیلو پولی —"

اس نے ہاتھ ایک دم آگے بڑھا کر آہستہ آہستہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"کہو مقصود! تم کہاں سے ٹپک پڑے ہو؟"

پھر رسمی باتیں ہونے لگیں۔

کلثوم کا ذکر آیا تو مقصود نے ہنستے ہوئے بتایا کہ کلثوم کی شادی ہو گئی ہے اور مجھے بالکل افسوس نہ ہوا اور پھر اس نے ایک دم بڑی جسارت اور لجاجت سے کہا:

"پولی! میرے ساتھ لاہور چلو دو دن کے لیے — صرف دو دن کے لیے۔"

مجھے اس کی یہ بات اس قدر بُری لگی ارجی ــــ کہ میں نے تنگ آ کر جواب دیا:
"تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے مقصود ؟ کیا میں اتنی چیپ ہوں ؟"
"وہ سب کچھ جس کی شاید تمہیں خبر نہیں ہے" ــــ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"۔۔۔۔ آخر تم نے ایسی بات کہی ہی کیوں؟"
"جی چاہا ۔۔۔۔؟"
"بس مجھے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ جانتے ہو، میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ میں کوئی کھلونا ہوں ؟"
اور ارجی! مجھے رونا آگیا اور میں اسے کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آئی۔ مجھے کوئی ہفتہ بھر اسی بات کا غصہ رہا۔ بار بار میرا جی چاہتا کہ ایک ڈانٹ بھرا خط اسے لکھوں لیکن چونکہ اس کا پتہ معلوم نہیں تھا اس لیے خاموش رہنا پڑا اور ایک دن وہ پھر اچانک ٹپک پڑا۔
"پولی! تم جانتی ہو کشمیری لوگ اپنی قوم سے باہر شادی نہیں کرتے ــ ورنہ ــ"
"لیکن میں نے کب تم سے فرمائش کی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو۔"
"آخر تمہارے ساتھ مل بیٹھنے کا کوئی طریق تو ہوگا۔ تم میرے ساتھ باہر نہیں جاتیں خط نہیں لکھتیں۔ کہیں ملنے کا وعدہ نہیں کرتیں۔ سینما نہیں جاتیں۔ آخر میں کیا کروں ؟"
"میں کھلونا نہیں ہوں مقصود ــــ اور یہ تمہارے ساتھ پھرنا پھرانا مجھے منظور نہیں۔ اگر تم میری خاطر دنیا اور خاندان کے خلاف سینہ سپر ہونے کی سکت نہیں رکھتے تو مجھے کیوں کوستے ہو۔ آخر تمہاری خاطر میں بھی تو بوڑھے باپ سے لڑائی مول لوں گی ــــ ہے نا ــــ !"
پتہ نہیں میں بے خیالی میں یہ سب ہی کچھ کیوں کہہ گئی۔

"پولی! — پولی!!" اس نے میری باتوں کی شہ پا کر کہا۔

"یہاں برآمدے میں یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہاں نوکر چاکر آتے جاتے ہیں۔ یہاں سکول کی مائیاں چوروں کی طرح دیکھتی ہیں۔ یہاں شاید اب بھی کسی دروازے کے ساتھ لگی تمہاری سہیلیاں تمہاری باتیں سُن رہی ہوں گی — چلو کمیٹی باغ —"

"مقصود! پھر وہی بات — سنو! میں کسی مرد کے ساتھ باہر نہیں جاؤں گی — بس یہی میرا اصول ہے — اور — اور —"

پولی خاموش ہو گئی۔ نیند کے مارے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے رسماً اس سے کہا:

"پولی! ذرا دیر کے لیے سو جاؤ۔"

"نہیں —" اس نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"ایسے انسان کا ذکر چھیڑا ہے تو اب نیند کہاں۔ اب تو کتھا سنا کر ہی نیند آئے گی — تمہیں دیکھ کر آج سارا زہر اُگل دینے کو جی چاہتا ہے۔"

ہاں تو ارجی! اس کے بعد ہم پھر کئی روز نہ ملے۔ وہ اس دفعہ خفا گیا تھا اور میں نے اسے منانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

ایک صبح وہ سکول کے وقت ہی آ گیا۔ میں دسویں جماعت کو پڑھا رہی تھی — ہیڈ مسٹریس کا رقعہ پہنچا اور میں ڈرتی ہوئی دفتر پہنچی۔

"مس اینڈریوز! آپ کے کزن آئے ہیں۔"

اور میں مسکراتی ہوئی اپنے نئے کزن سے ملنے چلی گئی۔

"کیوں آئے ہو تم؟" میں نے یونہی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"پولی! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" اس نے تپاک سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

"مجھے پہلے یہ انگوٹھی پہنانی چاہیے تھی" اس نے شرارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پولی! یہ ہماری منگنی کی انگوٹھی ہے۔ یاد رہے"
"اور ارجی! دیکھو۔ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے یاقوت و زبرجد پسند تھے یہ سادہ چھلا لعلوں سے جڑا ہوا دیکھتی ہو نا، یہ اسی کی نشانی ہے۔"
میں نے اس انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر وہ چھلا اس کے ہاتھ سے اتار لیا جائے تو وہ ہاتھ بالکل سونا ہو جائے گا جیسے کسی ہندو سہاگن کا فراخ ماتھا بغیر بندی کے اُجاڑ ہو جاتا ہے۔
ارجی! مجھے مقصود پر بڑا اعتماد تھا۔ میں اس کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ اس کے ساتھ لارنس گئی۔ سینما گئی۔ سارا دن انارکلی گھومتی رہی۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ بے وفا ہے — لیکن شاید اسے بے وفا کہنا بھی ٹھیک نہیں — وہ بے وفائی کی تعریف پر بھی پورا نہیں بیٹھتا۔
اس ہفتے کے بعد جب میں لاہور سے واپس آئی تو ڈیڈی سکول آئے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں غضب سے سُرخ ہو گئیں اور وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولے:
"پولی! تم نے منگنی کر لی اور اطلاع مجھے منگنی کے بعد دی۔ خوب!!"
"جی! —" میں نے اپنی سینڈل کو گھورتے ہوئے کہا۔
"جانتی ہو یہ ہندو مسلمان ہمارے نہیں ہو سکتے۔ ہمارے مذہب ...."
"لیکن ڈیڈی! مقصود تو ایسا نہیں" میں نے دیدہ دلیری سے کہا۔
"یہ تمہارا وہم ہے۔ اس قدر امیر باپ کا بیٹا کیا وفا کرے گا۔ وہ تمہارے ساتھ

کھیل رہا ہے ـــــ ابھی کچھ نہیں گیا۔ منگنی توڑ دو۔"

میں رونے لگی تو انھوں نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے یسوع مسیح سے دعا مانگنی شروع کر دی:

"اے خدا کے پاک بیٹے! میری لڑکی، گنہ گار لڑکی کو اتنی طاقت دے کہ وہ سچ جھوٹ، کفر اور ایمان میں تمیز کر سکے۔

اے پاک مریم کے پاک فرزند! اپنی اس بھیڑ کو واپس بلا لے۔ یہ ہم سے چھوٹتی جاتی ہے۔"

..... اور ارجی! میں نہ چاہتے ہوئے بھی ڈیڈی کے ساتھ زانو پر گر گئی ـــ لیکن میں نے منگنی نہیں توڑی۔

ڈیڈی نے مجھے بہت سمجھایا اور بہت لمبے چوڑے لکچر دیے۔ انھوں نے مجھ سے بار بار کہا، مقصود تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ محض تجھ سے کھیل رہا ہے اور جب کھیل سے جی بھر جائے گا تو کھلاڑی چلا جائے گا۔

مجھے ڈیڈی کی باتوں پر اعتبار تو نہ آیا لیکن ایک طرح کا کھٹکا پیدا ہو گیا اور جب دوسری بار ہم ملے تو میں نے مقصود سے ساری واردات کہہ دی۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے عجب بے بسی سے کہا:

"مقصود! شادی جلد ہی کر لیں۔ لوگ کیا سمجھیں گے۔ خود میرے ڈیڈی ـــ"

وہ جھلا گیا۔

"آخر تم کیا سمجھتی ہو؟ شادی، بیاہ کھیل تو نہیں کہ کاتا اور لے دوڑے۔ مجھے بھی اپنے ماں باپ کو منانا ہے۔ اپنی جائیداد سے کیسے ہاتھ دھو لوں؟ کم از کم تین سال ـــ"

"میں تین سال انتظار نہیں کروں گی۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تمہیں کرنا ہی ہوگا۔"

"کوئی دھونس ہے؟"

"ہاں۔ آخر تم میری منگیتر ہو اور پھر ــــ"

مجھے اس کی بات بہت بری لگی اور میں رونے لگی۔ مجھے روتے دیکھ کر اس نے گڑگڑا کر کہا:

"پولی! ــــ پولی خفا ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تم مجھے ملتی نظر نہیں آتی ہو ــــ اور جس طریق سے ملتی دکھائی دیتی ہو وہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ یعنی میں اپنے خاندان سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اب نہ تم چھوٹتی ہو اور نہ ہی خاندان۔ بتاؤ ہے نا مشکل؟"

اور وہ آنکھیں میچ کر سوچنے لگا۔ اس کے فراخ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مجھے اس کا تذبذب اس قدر برا لگا کہ کیا کہوں؟

میں نے چھلا اتار کر اس کے قریب رکھ دیا اور بولی:

"مقصود! یہ پہلے سوچنے کی باتیں تھیں۔ اب وقت نہیں رہا خیر ــــ خیر مجھے یہ منظور نہیں کہ تم اپنا خاندان چھوڑو ــــ اگر میری خوشی منظور ہے تو پھر مجھے ملنے نہ آنا۔"

اور واقعی وہ پھر مجھے ملنے نہ آیا۔

میری تبدیلی راولپنڈی ہو گئی۔ پنجاب کے چٹیل میدانوں سے دور میں پہاڑوں کی وادیوں میں کھو گئی اور وہاں مجھے راجو ملا۔ چھ مہینے کے لیے تو مجھے خود وہم ہو گیا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں ہر وقت اس کے متعلق سوچتی رہتی اور اس کی باتیں یاد کیا کرتی۔

لیکن ایک دن اس نے عجیب انداز میں کہا:

"پولی! تم مجھے بے حد پیاری لگتی ہو۔ بے حد! میں بہت بزدل ہوں۔ بے حد بزدل ــــ چاہتا تمہیں ہوں اور شادی رابعہ سے کروں گا۔"

اور اسی دن میری ساری محبت ختم ہو گئی۔ مجھے وہ بھی مقصود لگنے لگا لیکن میں راجو سے نفرت کرنے لگی اور مقصود کو میں بھولنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک دفعہ میں چھٹیوں میں گھر آ رہی تھی اور سنسان سٹیشن پر میں بنچ پر بیٹھی لاہور والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی کہ میری نگاہ مقصود پر پڑی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں اڑاتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" اس نے میرے پاس آ کر بڑی بے تکلفی سے کہا۔

"جہنم کے!"

"بڑی اچھی جگہ ہے"۔ وہ مسکراتا ہوا میرے پاس بیٹھ گیا:

"میں بھی گرمیاں گزارنے وہیں جا رہا ہوں لیکن اتنا عرصہ کہاں رہیں؟"

"جہنم میں"۔

"میں بھی وہیں تھا لیکن تم سے تو ملاقات نہ ہو سکی"۔

اور میں اس سے زیادہ دیر خفا نہ رہ سکی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا مدتوں کا بچھڑا ہوا دیرینہ رفیق ہو جو میرا نہ ہونے کے باوجود بھی میرا تھا۔

ہم دونوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اکیلے بیٹھے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا:

"پولی! تمہارے بعد نہ جانے کتنی لڑکیوں سے دل لگایا لیکن سچ پوچھو تو وہ بھی تمہاری یاد تازہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس عرصہ میں صرف یہی خیال دامن گیر رہا کہ کہیں پولی مل جائے تو اس سے معافی مانگ لوں اور پھر اس سے منگنی کر لوں اور ــــ"

"اور پھر توڑ دوں ــــ کیوں؟"

"ہاں پولی! تم میں وہ کیا بات ہے جو اوروں میں مجھے نظر نہیں آتی"۔

"جھوٹے کہیں کے!"

میں نے بھی سوچا کہ باوجود یکہ راجو اچھا تھا اور اس کا گناہ مقصود سے کم تھا لیکن وہ مقصود نہ تھا۔

لاہور پہنچنے سے پہلے میری انگلی میں پھر وہی چھلا تھا۔ میں پھر اس کی منگیتر تھی اور اس کے ساتھ جا رہی تھی ــــ"

گاڑی ہم دونوں کو کراچی کی طرف گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ باہر سوائے ہماری کھڑکی کی روشنی کے کسی قریبی ڈبے میں روشنی نہ آ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا دور دور پھیل چکا تھا اور سوائے گاڑی کی کھٹا کھٹ اور پولی کی دھیمی آواز کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ میرے بچے تھکے ماندے کھلاڑیوں کی طرح بے حال سو رہے تھے۔

"اُس مرتبہ ارجی! ایک عجیب و غریب واقعہ ہو گیا۔ ہم دونوں مارنس گئے۔ وہاں پہاڑی پر ایک سفید گلاب کی جھاڑی کے قریب ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تھے۔ مقصود مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ ہائے کس قدر باتیں کی تھیں اس دن ہم نے۔ چڑیوں کے کاغذی انڈوں سے لے کر ایٹم بم تک! میں بنچ کے ساتھ سر لگائے اس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی کہ سامنے والی پگڈنڈی پر ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا چکلا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے خوف اور غصے کے ملے جُلے جذبات میں پکارا:

"مقصود!"

اور مقصود اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پرائمری جماعت کا ڈرپوک بچہ استاد کی شکل دیکھ کر سہم جاتا ہے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ابّی!"

"یہ کون ہے؟"

میں بھی ششدر ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے جواب کی منتظر تھی ــــ

"یہ پولی ہے!"

"لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اور میں نے مقصود کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے اس کی محبت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہی تو موقع، یہی تو وقت تھا کہ وہ میری طرف داری کرتا، لیکن اس نے بڑے تحمل سے سر جھکا کر کہا:

"کچھ نہیں ابی!"

"جا لڑکی! اپنے گھر جا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا۔ "کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی بدنام کرتی ہے۔"

ارجی! میں مقصود کی طرف نگاہ کیے بغیر اپنی راہ چل دی۔ جس طرح میں گردن جھکائے دھیرے دھیرے پگڈنڈی پر اُترتی چلی جا رہی تھی اس طرح مقصود سے نفرت میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی دھکا دیا تھا لیکن اس دفعہ تو جیسے اس نے مجھے تحت الثریٰ میں دھکیل دیا۔

دوسرے دن میں نے اس کی انگوٹھی بذریعہ ڈاک واپس کر دی۔

وہ تین چار بار مجھے ملنے آیا لیکن ہر بار میں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ اس نے مجھے متعدد خط لکھے۔ معافی مانگی لیکن میں نہ پسیجی۔ میں اس سے نفرت کرنے کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن اپنے ذہن سے کھرچ رہی تھی۔ اس نے سکول میں میرے کمرے میں کودنے کی دھمکی دی لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ اس نے دریا میں غرق ہونے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن میں ملتفت نہ ہوئی۔ اس نے نہ صرف میری محبت کی توہین کی تھی بلکہ مخالفت کے سامنے میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس سے ایسی توقع نہ تھی۔

اور پھر ارجی! میں نے اسے بھولنے کے لیے، اس سے بدلہ لینے کے لیے آرچر سے منگنی کر لی۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں

اور میرا کوئی نہیں۔ ڈیڈی میرے والد ہوتے ہوئے بھی میرے نہ تھے اور تمام بوڑھوں کی طرح یسوع مسیح کے گُن گاتے رہتے تھے اور ارجی! جوانی میں غیر محسوس غیر مرئی چیزوں کی محبت کا اعتبار مشکل سے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مقصود کی الفت بھی کم ہوتی چلی گئی۔ اس کا سرخ و سپید رنگ یاد رہ گیا۔ اس کی سہمی ہوئی نگاہیں یاد رہ گئیں۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں ذہن سے چمٹی رہ گئیں پر اس کی محبت کو میں نے دل سے نکال دیا۔ میں اسے بھول گئی ارجی ـــــ اسے بھول گئی اور ایک سہارے کی خاطر آرچر سے منگنی کر لی۔ ڈیڈی اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو ایک پنتھ دو کاج کہ سہارا بھی ملا اور ڈیڈی کی خوشنودی بھی اور پھر آرچر مجھے چاہتا بھی تو تھا۔ کیا ہُوا اگر میں اسے پسند نہ کرتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ آخر مقصود میں کیا دھرا تھا جو آرچر میں نہیں۔

لیکن ایک خوف میری جان کو لاگو ہو گیا اور وہ یہی تھا کہ میں کسی دن یونہی جذبات کی رَو میں بہ کر یہ منگنی بھی نہ توڑ دوں اس لیے میں نے اپنی منگنی کی تصویر اخبار میں چھپوا دی اور شکر کا سانس لیا۔

آرچر ہوائی جہازوں کی ٹریننگ کے لیے لندن چلا تو میں بھی کراچی تک اسے چھوڑنے گئی۔ آخر کیوں نہ جاتی۔ میں نے اس سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

"لیکن ایک دن ارجی ـــــ!" اور وہ خاموش ہو گئی۔

اور باوجودیکہ مجھ پر نیند طاری ہو چلی تھی، میں چونک پڑی:

"اور ہاں پولی ایک ـــــ؟"

"ایک دن مقصود خدا جانے کہاں سے آ گیا۔ صبح دس بجے مجھے چٹ ملی۔ "للہ مجھے ملو۔" لیکن میں باہر نہ گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ گھنٹہ پون گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور شام کو سکول میں امن چین پھیل جانے کے بعد بھی یہی خبر آئی کہ وہ صاحب بیٹھے ابھی تک میرا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر مجھے ایک اور چٹ ملی:

"یقین مانو قیامت تک یونہی بیٹھا انتظار کرتا رہوں گا۔"

آخر مجھے اس سے لڑائی مول لینے کے لیے ہیڈ مسٹریس کے دفتر جانا ہی پڑا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ ہیڈ مسٹریس کے اندھیرے دفتر سے پنکھے کی آواز آ رہی تھی —— میں آگے بڑھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر میز پہ جھک گیا۔ شاید وہ رو رہا تھا۔

"پولی! —" اس نے دھیرے سے کہا۔ اور میں ہیڈ مسٹریس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کہو۔"

"آر چر سے منگنی توڑ کر یہ انگوٹھی پہن لو — ورنہ — ورنہ —" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"...... ورنہ تم مجھے مار ڈالو گے۔"

پھر مجھے رونا آگیا اور میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا:

"یا تو مجھے مار ڈالو مقصود یا اپنی ہمت کو زندہ — زندہ —" اور مجھ سے فقرہ مکمل نہ ہو سکا۔

"پولی! تم نہیں جانتیں یہ زندگی کتنی کٹھن ہے۔" اس نے بے بسی سے مجھے تکتے ہوئے کہا:

"زمانے کا گلوگیر ہاتھ بڑا ہی کرخت ہے۔ خاندان کی محبت بڑی دلکش ہے لیکن تم ان سے کہیں زیادہ دلفریب ہو — جانتی ہو پولی! میں نے اپنے باپ کی موت کی دعا مانگی ہے۔ اپنے خاندان کی —" اس نے اپنا تھکا ہوا سر پھر ہاتھوں پر رکھ لیا اور چپ ہو گیا۔

اس کی باتوں سے خلوص عیاں تھا لیکن میں بے اعتباری کے حربوں سے مزین ہو کر

آئی تھی۔

"چلو مری چلیں"۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"میں یہ ذکر سننا نہیں چاہتی"۔ مجھے غصّہ آ گیا۔

"پولی!"

اسے بھی غصّہ آ گیا:

"ساری عمر روتے روتے ذرا مشکل ہی سے گزرے گی"۔

"پروا نہیں"۔

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"آخر تم نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے مقصود؟"

"جانتی ہو ہم دونوں ازل سے ایک دوسرے کے تھے"

"میں ازل اور ابد کے قصّے نہیں جانتی۔ میں تو اس زندگی کو جانتی ہوں اور یہ جانتی ہوں کہ میں اِس دنیا میں تمہاری نہیں ہو سکتی چاہے تم ازل کے قصے کہو یا ابد کی داستانیں"۔

"پولی"۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا:

"آخری بار کہہ رہا ہوں۔۔۔۔"

"میں بھی آخری بار کہہ رہی ہوں کہ میں آرچر سے شادی کا وعدہ کر چکی ہوں"۔

اس نے ہی چھلّا جیب سے نکالا اور پھر عجیب سی بے بسی سے دیکھا اور میز پر دھر دیا اور دھیرے سے کمرے سے جاتے ہوئے کہا:

"اسے منگنی کی انگوٹھی نہ سمجھنا پولی! — یہ ایک نشانی ہے — تمہاری شادی کا پیشگی تحفہ —"

او رجانتی ہو ارچی! پھر کیا ہُوا؟ ایک بھیانک سی بات ہو گئی۔ ایک عجیب و غریب واقعہ" — پولی نے دفعتاً آنکھیں کھولیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا پولی؟" میں نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔
"مقصود نے اسی رات اپنے دماغ میں پستول داغ لی۔ اس کا آخری خط مجھے دو دن بعد ملا ــــ لکھا تھا :

پولی!

ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے
تھے لیکن، ہم دونوں ایک دوسرے کی تخریب کا
باعث بنے۔ میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ شاید
اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا ــ تم
سے میری تمام امیدیں وابستہ تھیں اور ــــ
میں تم سے ناخوش نہیں صرف اپنے سے ناخوش
جا رہا ہوں۔ میں نے دو بار تمہیں سخت پریشان
کیا ہے۔ پہلی بار تو واقعی میرا ارادہ شادی کا نہ
تھا لیکن دوسری بار پولی! یقین مانو میں تمہارا تھا
اور صرف تمہارا تھا اور میں تمہارا ہی رہا ہوں ــ
ازل سے ــــ !"

پولی خاموش ہو گئی اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی :
"ٹریجڈی یہ نہیں کہ اسے محبت کا جواب محبت میں نہ ملا۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس نے زندگی جیسی نعمت کی قدر نہیں کی ــ کاش وہ زندہ رہتا ــ کاش اسے علم ہوتا کہ انسانی زندگی کتنی قیمتی ہے ــ کس قدر خوبصورت ہے اور کچھ لوگ کیسے اسے سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور جیے جاتے ہیں حالانکہ جینے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوتی ــ "

پولی کی آواز بھرا گئی ــــ

اور ــــ

وہ ڈبے سے باہر دیکھنے لگی ــــ

باہر ــــ

اندھے اندھیروں میں کھڑکیوں سے جانے والی روشنی بھاگی جا رہی تھی!

مات

نہ جانے یہ چھرا کیسے چلا؟

آنٹی کو لگتا تھا کہ آج تک جتنی خبریں اخباروں میں چھپیں اور آیندہ بھی چھپتی رہیں گی وہ سب کی سب اس خبر کے سامنے بیکار ہیں۔ نہ تو یہ خبر پولیٹکل تھی نہ کسی ملک نے کسی اور ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر دی تھی۔ مرگِ ناگہانی، حادثہ، ڈکیتی یا اغوا کا بھی معاملہ نہ تھا۔ کھیلوں سے بھی اس خبر کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ خبر تو گھروں کے اشتہار، ٹینڈروں کے نوٹس، نوکریوں کی اطلاع اور فلموں کے سکینڈل سے بھی معمولی تھی لیکن اس خبر سے لپٹ کر آنٹی کا دل چپو ہو گیا۔

خبر کا تعلق دراصل جھنجھوڑنے، جھنجھوڑ نے اور کسی ثابت ذہن کو اس کے نقطۂ ثقل سے ہٹانے کا ہوتا ہے۔ شائستہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس بُری طرح وہ ساری عمر جھنجھوڑی ہلائی اور اپنے مرکز سے ہٹائی نہیں گئی۔ معاً اسے محسوس ہوا — وہ گوبھی کے پتوں کا انبار ہے جو سبزی منڈی کے باہر پڑا گلتا رہتا ہے اور جسے سیر چشم گائے بھینسیں بھی نہیں کھاتیں۔

شائستہ بیگت آنٹی تھی۔ اس نے آج تک یہ سوچا ہی نہ تھا کہ آنٹی خالہ، آپا، پھوپھی،